ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازیں۔

اس حبشی کے سوال وجواب ہی پر سورۂ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی، هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ حبشی نے حیرت سے سوال کیا یا رسول اللہ میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جنکو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟

آپ نے فرمایا: ہاں ضرور، یہ سنکر حبشی نومسلم نے رونا شروع کیا یہاں تک کر روتے روتے وہیں جان دیدی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس کی تجہیز وتکفین فرمائی۔

درجات کی تفصیل آیت کی تفسیر مع شانِ نزول اور متعلقہ تشریحات کے بیان ہوچکی، اب ایک بات قابلِ غور باقی رہ گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا جن لوگوں پر انعام ہے ان کے چار درجے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ درجے کس اعتبار سے ہیں؟ اور ان چار درجوں میں باہمی نسبت اور فرق کیا ہے، اور کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص میں جمع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات مفسرین نے اس بارے میں مختلف اقوال اور طویل تفصیل لکھی ہے، بعض نے فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتے ہیں، اور یہ سب صفات متداخلہ کی طرح ہیں، کیونکہ قرآن کریم میں جس کو نبی فرمایا گیا ہے اس کو صدیق وغیرہ کے القاب بھی دیئے گئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا، اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے، وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ آیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم ومعنی کے اعتبار سے یہ چار صفات اور درجات الگ الگ ہیں، لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ اور متکلم مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو مفسر بھی ہوں محدث بھی، فقیہ بھی اور مورخ ومتکلم بھی، یا جس طرح ڈاکٹر، انجینئر، پامسٹ مختلف صفات ہیں، اگر یہ سب کسی ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتی ہیں۔

البتہ عرفِ عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہوجاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے عامۂ مفسرین نے فرمایا کہ "صدیقین" سے مراد اجلہ صحابہ اور "شہداء" سے شہداءِ احد اور "صالحین" سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔

اور امام راغب اصفہانیؒ نے ان چاروں درجات کو مختلف درجات قرار دیا ہے، تفسیر بحر محیط، روح المعانی، اور مظہری میں بھی یہی مذکور ہے، یعنی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ وادنیٰ مقرر فرمائے ہیں، اور عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے، کہ وہ ان میں سے کسی کے درجہ سے پیچھے نہ رہیں، علم اور عمل جد وجہد کے ذریعہ ان درجات تک پہونچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوّت ایک ایسا مقام ہے جو جِدّ وجہد سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن انبیاءؑ کی معیت پھر بھی حاصل ہوجاتی ہے، امام راغبؒ نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جنکو قوتِ الٰہیہ کی امداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا: "اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى"۔

صدیقین کی تعریف دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دُور سے دیکھ رہا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کرسکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائق ایمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے۔ اس دیکھنے سے حضرت علیؓ کی مراد اسی قسم کی رُویت ہے کہ ان کی معرفت علمی مثل دیکھنے کے ہے۔

شہداء کی تعریف تیسرا درجہ شہداء کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے ربّ کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔

اور حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ میں بھی اسی قسم کی رُویت مراد ہوسکتی ہے۔

صالحین کی تعریف چوتھا درجہ صالحین کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید واتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دُور سے دیکھے، اور حدیث میں فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ، وارد ہوا ہے اس میں بھی رویت کا یہی درجہ مراد ہوسکتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ درجات معرفتِ ربّ کے درجات ہیں، اور معرفت کے مختلف درجات کی بناء پر مختلف مدارج ہیں ـــــ بہرحال آیت کا مضمون صاف ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے درجات عالیہ کے رہنے والوں کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ یہ معیت ہم سب کو نصیب کرے، آمین۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ

اے ایمان والو! لے لو اپنے ہتھیار پھر نکلو جُدی جُدی فوج ہو کر یا

انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ

سب اکٹھے، اور تم میں بعض ایسا ہے کہ البتہ دیر لگاوے گا پھر اگر

اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ

تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو کہے اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں نہ ہوا

مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ

ان کے ساتھ اور اگر تمکو پہنچا فضل اللہ کی طرف سے

لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ

تو اس طرح کہنے لگے گا کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی اے کاش کہ

كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ

میں ہوتا ان کے ساتھ تو پاتا بڑی مراد سو چاہیے لڑیں اللہ کی راہ

اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ

میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے اور جو کوئی

يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ

لڑے اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے یا غالب ہووے تو ہم دیویں گے اس کو

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

بڑا ثواب

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (کافروں کے مقابلہ میں) اپنی تو احتیاط رکھو (یعنی ان کے داؤ گھات سے بھی ہوشیار رہو اور مقاتلہ کے وقت سامان، ہتھیار، ڈھال اور تلوار سے بھی درست رہو) پھر (ان سے مقاتلہ کے لئے) متفرق طور پر یا مجتمع طور پر (جیسا موقع ہو) نکلو اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعضے منافقین بھی شامل ہو رہے ہیں) بعضا بعضا شخص ایسا ہے (مراد

اس سے منافق ہے) جو (جہاد سے) ہٹتا ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا (جیسے شکست وغیرہ) تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہو کر) کہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا، (نہیں تو مجھ پر بھی مصیبت آتی) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح و غنیمت) تو ایسے طور پر (خود غرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں (مال کے فوت ہونے پر تاسف کر کے) کہتا ہے، ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی لوگوں کا شریکِ حال ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی (کہ مال و دولت لاتا اور خود غرضی اور بے تعلقی اس کہنے سے ظاہر ہے ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی کامیابی پر بھی تو خوش ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنا افسوس کرنے بیٹھ جائے اور اس کی خوشی کا نام بھی نہ لے، اللہ تعالیٰ اس شخص کے حق میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی مفت نہیں ملتی اگر اس کا طالب ہے) تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے جو کہ موقوف ہے ایمان و اخلاق پر، یعنی مسلمان و مخلص بن کر) ان (کافر) لوگوں سے لڑے جو آخرت (چھوڑ کر اس) کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی اس شخص کو اگر فوزِ عظیم کا شوق ہے تو دل درست کر لے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، تیغ و سنان کے سامنے سینہ سپر بنے دیکھو فوزِ عظیم ہاتھ آتا ہے یا نہیں، اور یوں کیا کوئی دل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی مصیبت جھیلے سچی کامیابی اس کی ہے، کیونکہ دنیا کی کامیابی اوّل تو حقیر، پھر کبھی ہے کبھی نہیں، کیونکہ اگر غالب آ گئے تو ہے ورنہ نہیں) اور (آخرت کی کامیابی جو کہ ایسے شخص کے لئے موعود ہے ایسی ہے کہ عظیم بھی اور پھر ہر حالت میں ہے کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ (مغلوب ہو جائے حتیٰ کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آ جائے ہم (ہر حالت میں) اس کو (آخرت کا) اجرِ عظیم دیں گے (جو کہ فوزِ عظیم کہنے کے لائق ہے)۔

ربطِ آیات اس سے قبل اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا ذکر تھا، آگے ان آیات سے فرمانبرداروں کو احیاءِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے (قرطبی)

معارف و مسائل

فوائدِ مہمہ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ الخ اس آیت کے پہلے حصہ میں جہاد کرنے کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا گیا، اور دوسرے حصہ میں اقامِ جہاد کا، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی جس کو متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ

ظاہری اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں اسلحہ کی فراہمی کا حکم تو دیدیا گیا، لیکن یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اس کی وجہ سے تم یقیناً ضرور محفوظ ہی رہو گے، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا گیا کہ اسباب کا اختیار کرنا صرف اطمینانِ قلبی کے لئے ہوتا ہے، ورنہ ان میں فی نفسہٖ نفع و نقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے، جیسے ارشاد ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا	"یعنی اے نبی آپ کہدیجئے کہ ہم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے"

① اس آیت میں پہلے تو جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا گیا، اس کے بعد اس کے لئے نکلنے کا نظم بتلایا گیا، جس کے لئے دو جملے ذکر کئے گئے، یعنی فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا، ثبات، ثُبَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنے چھوٹی سی جماعت کے ہیں، جس کو فوجی دستہ (سریہ) کہتے ہیں، یعنی اگر تم جہاد کے لئے نکلو تو اکیلے اور تنہا نہ نکلو، بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں نکلو، یا ایک کثیر (جمیعاً) لشکر کی صورت میں جاؤ، کیونکہ اکیلے لڑنے کے لئے جانے میں نقصان کا قوی احتمال ہوتا ہے، اور دشمن ایسے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

یہ تعلیم تو جہاد کے موقع کے لئے مسلمانوں کو دی گئی ہے، لیکن عام حالات میں بھی شریعت کی یہی تعلیم ہے، کہ اکیلے سفر نہ کیا جائے، چنانچہ ایک حدیث میں تنہا مسافر کو ایک شیطان کہا گیا اور دو مسافروں کو دو شیطان اور تین کو جماعت فرمایا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

خَيْرُ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةٌ وَّخَيْرُ السَّرَايَا اَرْبَعُ مِائَةٍ وَّخَيْرُ الْجُيُوْشِ اَرْبَعَةُ اٰلَافٍ (رواہ الطبرانی بحوالہ مشکوٰۃ)	"یعنی بہترین ساتھی چار ہیں اور بہترین فوجی دستہ چار سو کا ہے، اور بہترین لشکر چار ہزار کا ہے"

② وَاِنَّ مِنْكُمْ الخ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مؤمنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ مؤمنین کی نہیں ہو سکتیں، اس لئے علماء قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے خطاب میں ان کو مؤمنین کی ایک جماعت کہا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ
اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں اے رب ہمارے
اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا
نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کر دے ہمارے لئے
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾
اپنے پاس سے کوئی حامی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار،
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ
لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں سو لڑو تم شیطان کے حمایتیوں سے
اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾
بیشک فریب شیطان کا سست ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو (باوجودیکہ اس کا قوی داعی موجود ہے، کیونکہ یہ جہاد) اللہ کی راہ میں (ہوتا ہے، یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے جس کا اہتمام ضروری ہے) اور (اس اعلاء دین کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ) کمزور (ایمان دار) لوگوں کی خاطر سے (بھی لڑنا ضرور ہے تاکہ کفار کے پنجۂ ستم سے رہائی پائیں)، جن (بیچاروں) میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو (کفار سے تنگ و پریشان ہو کر) دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (کسی طرح) اس بستی سے (یعنی مکہ سے جو ہمارے لئے جیل خانہ بنا ہوا ہے) باہر نکال، جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں، (کہ ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے) اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے (کہ ہماری حمایت کر کے ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑا دے) جو لوگ پکے ایمان دار ہیں (وہ تو ان احکام کو سنکر) اللہ کی راہ میں (یعنی

غلبۂ اسلام کے قصد سے) جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں (یعنی غلبۂ کفر کے قصد سے) لڑتے ہیں' (اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں نصرت اللہ کی طرف سے ایمان داروں کو ہوگی، جب ایمان داروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے) تو (اے ایماندارو) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جو کہ اللہ کی مدد سے محروم ہیں) جہاد کرو' (اور گو وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں لیکن) واقع میں (وہ شیطانی تدبیریں ہیں کہ شیطان ان کفری تدبیروں کا حکم کرتا ہے) شیطانی تدبیر (خود) لچر ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں غیبی امداد نہیں ہوتی، اور کبھی چند روزہ غلبہ ہو جانا تو ان کو چند روزہ مہلت اور ڈھیل دینا ہے، تو غیبی امداد جو مؤمنین کے ساتھ ہے وہ تدبیر اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔

خلاصہ یہ کہ داعی بھی ہے اور وعدۂ نصرت بھی ہے، پھر کیا عذر ہے! اس لئے مکرر تاکید کی گئی۔

معارف ومسائل

مظلوم کی فریاد رسی اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے

مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی ضعف اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے، اور بعد میں کافروں نے بھی ان کو جانے سے روک دیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کر دیں، تاکہ یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں، ان حضرات میں سے بعضوں کے نام بھی تفاسیر میں مذکور ہیں، مثلاً ابن عباسؓ اور ان کی والدہؓ، سلمہ بن ہشامؓ، ولید بن ولیدؓ، اور ابو جندل بن سہلؓ (قرطبی) یہ حضرات اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے ان کے ظلم وستم کو جھیلتے اور سہتے رہے، اور اسلام پر بڑی مضبوطی سے جمے رہے، البتہ اللہ تعالیٰ سے ان مصائب سے نجات کی دعائیں انھوں نے برابر جاری رکھیں، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاد کر کے ان کو کفار کے جبر وتشدد سے چھٹکارا دلوائیں۔

اس آیت میں مؤمنین نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی تھی، ایک یہ کہ ہم کو اس قریہ سے نکالیں (یہاں قریہ سے مراد مکہ ہے) دوسری یہ کہ ہمارے لئے کوئی ناصر اور مددگار بھیجدیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دونوں باتیں قبول فرمائی ہیں، اس طرح کہ بعض کو وہاں سے نکلنے کے مواقع میسر کئے، جس سے ان کی پہلی بات پوری ہوئی، بعض اسی جگہ رہے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسیدؓ کو ان کا متولی مقرر کیا، جنھوں نے مظلومین کو ان کے ظالمین سے نجات دلائی، اس طرح

سے ان کی دوسری بات بھی پوری ہوگئی، اس آیت میں صاف لفظوں میں حکم قتال دینے کے بجائے قرآن نے یہ الفاظ اختیار کئے، مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ، جن میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال وجہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ ہے، جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا تمام مصائب کا بہترین علاج ہے

آیت يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا سے یہ بتلایا گیا کہ حکم قتال کا ایک سبب ان کمزور مسلمان مردوں اور عورتوں کی دعا بھی تھی جس کی قبولیت مسلمان کو حکم جہاد دے کر کی گئی، اور ان کی مصائب کا فوری خاتمہ ہوگیا۔

بیشک تو سب کرتے ہیں مگر اس سے مومن اور کافر کے مقاصد الگ الگ ہیں

آلَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الخ اس آیت میں بتلایا گیا کہ مؤمنین اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مؤمن کی جد وجہد کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج ہو، اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے، اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے، اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا، دنیا کے امن کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے، لہٰذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے یہی مقصد ہوتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو، اور طاغوتی قوتیں برسر اقتدار آئیں تاکہ دنیا میں کفر وشرک خوب چمکے، اور چونکہ کفر وشرک شیطان کی راہیں ہیں، اس لئے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

شیطان کی تدبیر ضعیف ہے

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا اس آیت میں بتلایا گیا کہ شیطانی تدابیر لچر اور کمزور ہوتی ہیں، اس کی وجہ سے وہ مومنین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لہٰذا مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں سے لڑنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ ان کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور کافروں کو شیطان کی تدبیر کوئی فائدہ نہ دے گی۔

چنانچہ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا کہ پہلے شیطان کافروں کے سامنے لمبی ڈینگیں مارتا رہا، اور اس نے کافروں کو مکمل یقین دلایا کہ "لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ" آج کے دن تم لوگوں کو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اس لئے کہ "إِنِّي جَارٌ لَّكُمْ" (میں تمہارا مددگار ہوں) میں اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ تمہاری مدد کو آؤں گا، جب جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اگرچہ آگے بڑھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حمایت میں فرشتے آپہنچے ہیں تو اس نے اپنی تدبیر کو ناکام پاکر الٹے پاؤں بھاگنا شروع کر دیا، اور اپنے دوستوں یعنی

کافروں سے کہا: "اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ ، وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝" میں تم لوگوں سے بری ہوں، اس لئے کہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی فرشتوں کا لشکر) میں اللہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے" (مظہری)

اس آیت میں شیطان کی تدبیر کو جو ضعیف کہا گیا ہے اس کے لئے اسی آیت سے دو شرطیں بھی مفہوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ آدمی جس کے مقابلہ میں شیطان تدبیر کر رہا ہے مسلمان ہو، اور دوسری یہ کہ اس کا کام محض اللہ ہی کے لئے ہو، کوئی دنیوی نفسانی غرض نہ ہو، پہلی شرط اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اور دوسری یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ سے معلوم ہوتی ہے، اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی فوت ہو جائے تو پھر ضروری نہیں کہ شیطان کی تدبیر اس کے مقابلہ میں کمزور ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب تم شیطان کو دیکھو تو بغیر کسی خوف و خدشہ کے اس پر حملہ کر دو۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا (احکام القرآن للسیوطی)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا
کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور قائم رکھو
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ
نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا
اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ
اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ
زیادہ ڈر اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ
اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ
چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک کہہ دے کہ فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۷۷
اور آخرت بہتر ہے پرہیزگار کو اور تمہارا حق نہ دبے گا ایک تاگے برابر

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ
جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو آ پکڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں
مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ
میں اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں یہ اللہ کی طرف سے
اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۗ
ہے اور اگر انکو پہنچے کچھ برائی تو کہیں یہ تیری طرف سے ہے
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ
کہہ دے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے سو کیا حال ہے ان لوگوں کا ہرگز نہیں
يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝۷۸ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ
لگتے کہ سمجھیں کوئی بات جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے،
وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۗ وَاَرْسَلْنٰكَ
اور جو تجھ کو برائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھ کو بھیجا پیغام
لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹
پہنچانے والا لوگوں کو اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (قبل نزول حکم جہاد تو جنگ کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ) ان کو (منع کرنے کے لئے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رہو اور (جو جو حکم تم کو ہو چکے ہیں اس میں لگے رہو مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی اور یا) پھر ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو کیا حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (مخالف) لوگوں سے (طبعاً) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کر دیں گے) جیسا (کوئی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دشمن کا ڈر طبعی ہے، اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقلی حالت سے شدید ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی امید رحمت بھی تو ہے اور کافر دشمن سے تو ضرر کا خوف ہی خوف ہے، اور چونکہ یہ خوف

طبعی تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا) اور (یا حکم قتال کو ملتوی کرنے کی تمنا میں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور خدا تعالیٰ کے علم میں قول نفسی قول لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے (ابھی سے) ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدت مہلت دیدی ہوتی (ذرا بے فکری سے اپنی ضروریات پوری کرلیتے اور چونکہ یہ عرض کرنا بطور اعتراض یا انکار کے نہ تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ دنیا سے فائدہ اٹھانا (جس کے لئے تم مہلت کی تمنا کرتے ہو محض) چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے لئے سامانِ آخرت کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جاوے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے اُن کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو اور اگر جہاد بھی نہ کیا تو وقت معین پر موت سے بچ جاؤ گے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ) تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں موت آ دبائے گی اگرچہ تم پختہ مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو (غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مر کر دنیا کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ بلکہ عقل کی بات یہ ہے کہ بیع "چند روزہ جہد کن باقی بخند" اور اگر ان (منافقین) کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح و کامیابی) تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ (اتفاقاً) ہو گئی (ورنہ مسلمانوں کی بے تدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر ان کی کوئی بُری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت و قتل) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ (کی اور مسلمانوں کی بے تدبیری) کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرما دیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں بلکہ) سب کچھ (نعمت و نقمت) اللہ ہی کی طرف سے ہے (گو ایک بلا واسطہ اور ایک بواسطہ جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے بلا واسطہ اعمال ہے اور نقمت یعنی مصیبت اللہ کے عدل سے بواسطہ اعمال سیئہ عباد کے ہے پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو واقع میں اعمال سیئہ کا اس میں دخل ہے، جیسا اُحد میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے، اگر آدمی ذرا بھی غور کرے تو خوش حالی کے قبل کوئی نیک عمل اس درجہ کا نہ پاوے گا جس محض فضل کی

ثابت ہوگا، اور بدحالی کے قبل ضرور کوئی عمل بد پاوے گا، جس کی سزا اس سے زیادہ ہوتی، جب یہ ایسی ظاہر بات ہے) تو ان (حماقت شعار) لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے (اور سمجھیں گے تو کیا اور وہ تفصیل اس اجمالی جواب مذکور کی یہ ہے کہ) اے انسان تجھ کو جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے (فضل) ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی (اعمال بد کے) سبب سے ہے (پس اس بدحالی کو شریعت کے احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ کہنا یا شارع کی طرف اس کی نسبت کرنا بوری جہالت ہے، جیسا منافقین جہاد اور امام الجہاد کی طرف اس کی نسبت کرتے تھے) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور (اگر کوئی منافق، کافر انکار کرے تو اس کے انکار سے نفی نبوت کی کب ہو سکتی ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کے) گواہ کافی ہیں (جنھوں نے قولی اور فعلی شہادت دی ہے، قولی تو مثلاً یہی کلمہ "وَاَرْسَلْنٰكَ" اور فعلی یہ کہ معجزات جو دلیل اثباتِ نبوت ہیں آپ کو عطا فرمائے)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ الخ مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستایا کرتے تھے، مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں، آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے تھے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں، بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے، اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ، کیونکہ جب تک آدمی اطاعتِ خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیفِ جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان دینا بہت دشوار ہوتا ہے، اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا، پھر ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو جہاد کا حکم ہوا تو ان کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی، مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، یا اس سے بھی زیادہ اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

حکمِ جہاد نازل ہونے پر مسلمانوں کی طرف سے التواءِ حکم کی تمنا کس وجہ سے ہوئی

حکم جہاد پر مسلمانوں کی طرف سے مہلت کی تمنا درحقیقت کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ ایک لطف آمیز شکایت تھی،

جس کی وجہ یہ تھی کہ عادۃً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کو انتہائی تنگی و تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اس لئے ایسے وقت میں انتقام لینا زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن آرام و راحت کے وقت اس کی طبیعت لڑائی کی طرف آمادہ نہیں ہوتی، یہ ایک بشری تقاضا ہے، چنانچہ یہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو اس وقت کفار کی ایذاؤں سے تنگ آ کر جہاد کے حکم کی تمنا کرتے تھے، لیکن مدینہ میں آ کر جب ان کو سکون و آرام نصیب ہوا تو ایسی صورت میں جب قتال کا حکم ہوا تو اس وقت ان کا پرانا جذبہ کم ہو چکا تھا اور ان کے دلوں میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا، اس لئے انھوں نے محض ایک تمنا کی کہ اگر اس وقت جہاد کا حکم نہ ہوتا تو بہتر تھا، اس تمنا کو اعتراض پر محمول کر کے ان مسلمانوں کی طرف معصیت کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، یہ تقریر اس صورت میں ہے جب کہ انھوں نے شکایت کا اظہار زبان سے بھی کیا ہو، لیکن اگر زبان سے نہیں کیا محض ان کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا ہو تو وساوس قلبی کو شریعت نے معصیت ہی شمار نہیں کیا، یہاں یہ دونوں احتمال ہیں، اور آیت کے لفظ قَالُوْا سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انھوں نے زبان سے اظہار کر دیا تھا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دل میں کہا ہو (بیان القرآن ملخصاً) بعض مفسرین کے نزدیک آیات کا تعلق مؤمنین سے نہیں ہے بلکہ منافقین سے ہے، اس صورت میں کسی قسم کا اشکال نہیں (تفسیر کبیر)

اصلاحِ ملک سے اصلاحِ نفس مقدم ہے

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، اللہ تعالیٰ نے پہلے نماز اور زکوٰۃ کے احکام کو بیان فرمایا، جو اصلاحِ نفس کا سبب ہیں، اور اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اصلاحِ ملک کا سبب ہے یعنی اس کے ذریعہ سے ظلم و ستم کا استیصال کیا جاتا ہے اور ملک میں امن و امان قائم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے، چنانچہ درجہ کے اعتبار سے بھی قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور ثانی کا فرض کفایہ ہے، جس سے اصلاحِ نفس کی اہمیت اور اس کا مقدم ہونا ظاہر ہے (منظری)

دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں فرق

آیت میں دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو افضل اور بہتر کہا گیا ہے، اس کی مندرجہ ذیل چند وجوہ ہیں۔

۱۔ دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔

۲۔ دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہیں اور آخرت کی باقی رہنے والی ہیں۔

۳۔ دنیا کی نعمتوں کے ساتھ طرح طرح کی پریشانیاں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں ان کدورتوں سے پاک ہیں۔

۴۔ دنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں ہے اور آخرت کی نعمتیں ہر متقی کو یقیناً ملیں گی (تفسیر کبیر)

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۚ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۗ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۗ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

"یعنی اس ناپائیدار دنیا میں ایسے شخص کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائیدار گھر یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ ہو، پھر اگر دنیا کچھ لوگوں کو فریفتہ کرے تو آگاہ رہیں کہ یہ دنیا تو متاع قلیل ہے، اور اس کا زوال و ناپید ہونا بہت قریب ہے، یعنی ادھر آنکھ بند ہوئی اور ادھر آخرت سامنے آئی۔"

ایک عبرت ناک واقعہ

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ الخ اللہ تعالیٰ نے اس آیت جہاد سے رکنے والوں کے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ شاید جہاد سے جان بچا کر موت سے بھی بچ سکتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ موت ایک دن آ کر رہے گی خواہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں موت آئے گی، جب یہ بات ہے تو تمہارا جہاد سے منہ پھیرنا بیکار ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرت ناک واقعہ بروایت ابن جریرؒ و ابن ابی حاتم عن مجاہدؒ لکھا ہے، کہ پہلی امتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضع حمل کا وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لئے بھیجا، وہ دروازہ سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے پوچھا کہ یہ عورت کیا جنی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ آپ یاد رکھئے! یہ لڑکی ستر مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر ایک مکڑی سے مرے گی، ملازم یہ سنکر واپس ہوا، اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، اور سوچا کہ اب یہ مرگئی ہے تو بھاگ گیا، مگر پیچھے لڑکی کی ماں نے ٹانکے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ لڑکی جوان ہو گئی، اور خوب صورت اتنی تھی کہ اس شہر میں وہ بے مثال تھی، اور اس ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی، اور کافی عرصہ تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑھیا ملی، تو اس سے ذکر کیا، کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ خوب صورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس عورت نے کہا کہ فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوب صورت نہیں ہے، آپ اسی سے شادی کر لیں، آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کر لی، تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو! اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک لڑکی کا میں پیٹ چاک کر کے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا، یہ سنکر وہ

بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنا پیٹ دکھایا جس پر نشان موجود تھا، یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں، ایک یہ کہ تو سو مردوں سے زنا کرے گی، اس پر عورت نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں، مرد نے کہا تعداد سو ہے، دوسری بات یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کرایا جس میں مکڑی کے جالے کا نام تک نہ تھا، ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکڑی نظر آئی، عورت بولی کیا مکڑی یہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا ہاں! اس پر وہ فوراً اٹھی، اور کہا کہ اس کو تو میں فوراً مار دوں گی، یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پاؤں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔ مکڑی تو ہلاک ہوگئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں، جو اس کی موت کا پیغام بن گئیں۔ (ابن کثیر)

یہ عورت صاف ستھرے شاندار محل میں اچانک ایک مکڑی کے ذریعہ ہلاک ہوگئی، اس کے بالمقابل کتنے ایسے آدمی ہیں کہ عمر بھر جنگوں اور معرکوں میں گذار دی وہاں موت نہ آئی، حضرت خالد بن ولیدؓ جو اسلام کے سپاہی اور جرنیل معروف و مشہور ہیں، اور سیف اللہ ان کا لقب ہے پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے اور ہزاروں کافروں کو تہہ تیغ کیا، ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا، اور ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ میری موت عورتوں کی طرح چارپائی پر نہ ہو، بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدانِ جہاد میں ہو لیکن آخر کار ان کی موت بستر پر ہی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کا نظام قادرِ مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے، جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر ایک مکڑی کے ذریعہ مار دے اور بچانا چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بچالے۔

پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے خلاف نہیں

وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ، اس آیت میں کہا گیا کہ موت تم کو بہر کیف پہنچ کر رہے گی، اگرچہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رہنے سہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لئے مضبوط و عمدہ گھر تعمیر کرنا نہ خلافِ توکل ہے، اور نہ خلافِ شرع ہے۔ (قرطبی)

انسان کو نعمت محض اللہ کے فضل سے ملتی ہے

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ، یہاں حسنۃ سے مراد نعمت ہے۔ (مظہری)

اس آیت سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ انسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنی ہی عبادت

کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے پھر اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، ان کو محدود عبادات اور طاعات سے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہماری عبادت بھی رب العالمین کی بادشاہت کے شایانِ شان نہ ہو۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَا اَحَدٌ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ قِیْلَ وَلَا اَنْتَ قَالَ وَلَا اَنَا (متفق علیہ) (بحوالہ مظہری)

کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا، بجز اللہ تعالیٰ کی رحمت کے۔ راوی نے عرض کیا آپ بھی نہیں جائیں گے؟ فرمایا ہاں میں بھی نہیں۔

مصیبت انسان کے شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ، یہاں سیّئۃ سے مراد مصیبت ہے (مظہری)

مصیبت کی تخلیق اگرچہ اللہ ہی کرتا ہے، لیکن اس کا سبب خود انسان کے اعمالِ بد ہوتے ہیں، اب اگر یہ انسان کافر ہے تو اس کے لئے دنیا میں جو مصیبت پیش آتی ہے یہ اس کے لئے اس عذاب کا ایک معمولی سا نمونہ ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر وہ مؤمن ہے تو اس کے لئے مصائب و تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ ہو کر نجاتِ آخرت کا سبب ہو جاتی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

مَا مِنْ مُّصِيْبَةٍ تُصِيْبُ الْمُسْلِمَ اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا عَنْهُ حَتّٰى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا (ترمذی بحوالہ مظہری)

"یعنی کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو کسی مسلمان کو پہنچے، مگر وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اس کے پاؤں میں چبھتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُصِيْبُ عَبْدًا نَكْبَةٌ فَمَا فَوْقَهَا وَمَا دُوْنَهَا اِلَّا بِذَنْبٍ وَمَا يَعْفُوْا اَكْثَرُ

"حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کو جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے، اور بہت گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔"

(ترمذی بحوالہ مظہری)

آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے عام ہے

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ، اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رسالت پورے عالم کے انسانوں کے لئے عام ہے، خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تا قیامت پیدا ہوں (مظہری)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ

جس نے حکم مانا رسولؐ کا اس نے حکم مانا اللہ کا اور جو اُٹا پھرا تو ہم نے

اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝٨٠

تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان

خلاصۂ تفسیر

جس شخص نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عقلاً بھی واجب ہے، پس آپ کی اطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص (آپ کی اطاعت سے) روگردانی کرے سو (آپ کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے) آپ کو (بطور ذمہ داری کے) ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا (کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں، بلکہ آپ کا فرض پیغام پہنچا دینے سے پورا ہو جاتا ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ کفر کریں تو آپ پر کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں آپ بے فکر رہیں)

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ

اور کہتے ہیں قبول ہے پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے

مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ

ان میں سے رات کو اس کے خلاف جو تجھ سے کہہ چکے تھے اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝٨١

سو تو تغافل کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ

کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے

لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝٨٢

تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے احکام سنکر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری رجسٹر نامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں، (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے، اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا) کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تاکہ اس کا کلام الٰہی ہونا واضح ہو جائے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس (کے مضامین) میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے واقعیات سے اور حدِ اعجاز سے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف و تفاوت ہوتا تو مضامین کثیرہ میں اختلافات کثیرہ ہوتے، حالانکہ ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، پس لامحالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا)

معارف و مسائل

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ، اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دورخی پالیسی رکھتے ہیں زبان سے کچھ کہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

پیشوا کے لئے ایک اہم ہدایت فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

جب منافقین آپؐ کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپؐ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپؐ کی نافرمانی کرنے کے لئے مشورے کرتے، اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت دی کہ ان کی پروا نہ کیجئے، آپؐ اپنا کام اللہ کے بھروسہ پر کرتے رہیں، کیونکہ وہ آپؐ کے لئے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کے اُلٹے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

تدبرِ قرآن اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ قرآن میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس میں چند چیزیں قابلِ غور ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ فرمایا اَفَلَا یَفْقَہُوْنَ نہیں فرمایا، اس سے بظاہر ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ وہ اگر گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں تو ان کو اس کے معانی و مضامین میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا، اور یہ مفہوم تدبر کے عنوان سے ہی ادا ہوسکتا ہے، صرف تلاوت اور قرأت جس میں تدبر اور غور و فکر نہ ہو اس سے بہت سے اختلافات نظر آنے لگتے ہیں، جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے ہے صحیح نہیں ہے، البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ائمۂ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالیگا عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلیدِ کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہوسکے تو کوئی مستند و معتبر تفسیر کا مطالعہ کریں، اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں، اور ماہر علماء سے رجوع کریں۔

قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کیلئے شرائط ہیں

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ تدبر کے درجات متفاوت اور ہر ایک کا حکم الگ ہے مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے تاکہ وہ نتائج کا استخراج صحیح کرسکے، اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا، جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکالے گا، اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔

یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینیروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانونِ ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرینِ قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی! میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کرسکتا ہوں، اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ، پھر بلاشبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو، لیکن یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جائے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں! کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح و تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

قیاس کا ثبوت اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن و

سنت میں نہ ملے تو انہی میں غور و فکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے، اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبی)

اختلافِ کثیر کی تشریح وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ، اختلافِ کثیرہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مضمون میں اختلاف ہوتا تو مضامین کثیرہ کا اختلاف بھی کثیر ہوجاتا (بیان القرآن) لیکن یہاں کسی ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بشر کے کلام میں یہ یکسانیت کہاں، نہ کسی جگہ فصاحت و بلاغت میں کمی، نہ توحید و کفر اور حلال و حرام کے بیان میں تناقض اور تفاوت، پھر غیب کی اطلاعات میں بھی نہ کوئی خبر ایسی ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو، نہ نظمِ قرآن میں کہیں یہ فرق کہ بعض فصیح ہو اور بعض رکیک، ہر بشر کی تقریر و تحریر پر ماحول کا اثر ہوتا ہے، اطمینان کے وقت کلام اور طرح کا ہوتا ہے پریشانی کے وقت دوسری طرح کا ہے، مسرت کے وقت اور رنگ ہوتا ہے اور رنج کے وقت دوسرا ، لیکن قرآن ہر قسم کے تفاوت اور تناقض سے پاک ہے اور بالاتر ہے، اور یہی کلام الٰہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا

اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے

بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ

ہیں اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کر نیوالے ہیں اس کی اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان کو کسی امر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ امر موجب) امن ہو یا (موجب) خوف (مثلاً کوئی لشکر مسلمانوں کا کسی جگہ جہاد کے لئے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی، یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی یہ خوف کی خبر ہے) تو اس

(خبر) کو (فوراً) مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا مصلحتِ انتظامیہ کے خلاف ہوتا ہے) اور اگر (بجائے خود مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو (حضرات اکابر صحابہؓ) ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے اوپر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت و غلط اور قابلِ تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں (جیسا ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا! آگے احکام مذکورہ سنانے کے بعد جو سراسر متضمن مصالح دنیویہ و اخرویہ ہیں بطور منت کے مسلمانوں کو ارشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا اپنا پیغمبر بھیجا یہ اگر) نہ ہوتا تو تم سب کے سب (ضرر دنیوی و اخروی اختیار کر کے) شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو بدولت عقلِ سلیم خداداد کے کہ وہ بھی ایک خاص فضل و رحمت ہے اس سے محفوظ رہتے ورنہ زیادہ تباہی میں پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جنکی معرفت ایسے مصالح کے احکام آتے ہیں برخلاف مذکورہ منافقین کے بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اور پوری اطاعت کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ، ابن عباس، ضحاک اور ابو معاذ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور حضرت حسنؒ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی)

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شانِ نزول میں حضرت عمر بن خطابؓ کی حدیث کو ذکر کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپؐ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپؓ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، چنانچہ آپؓ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ نہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ الخ (تفسیر ابن کثیر)

بے تحقیق باتوں کا اڑانا گناہ اور بڑا فتنہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ، یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا، مَنْ حَدَّثَ بِحَدِيْثٍ وَهُوَ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبَيْنِ. "یعنی جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔" (تفسیر ابن کثیر)

اولوالامر کون لوگ ہیں؟

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ الخ استنباط، اصل میں کنوئیں کی تہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں، کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماء مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا (قرطبی)

اولوالامر کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں، حضرت حسن، قتادہؒ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امراء اور حکام مراد ہیں، ابوبکر جصاصؒ ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ اولی الامر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اولی الامر اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو، اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک جبر و تشدد سے، وہ تو صرف اہل حکومت ہی کر سکتے ہیں، دوسری صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے، جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے، کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، اور از روئے شرع ان پر ان کے احکام کی اطاعت واجب بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اولوالامر کا اطلاق صحیح ہے (احکام القرآن للجصاص)

اس بحث کی مزید تفصیل آیت اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے تحت بھی گذر چکی ہے۔

مسائل جدیدہ میں قیاس و اجتہاد عوام کے لئے تقلید ائمہ کا ثبوت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے احکام اجتہاد و قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تامہ رکھتے ہیں۔

اس بیان سے چند امور مستفاد ہوئے ہیں:

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں، بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں، جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔ (احکام القرآن للجصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی استنباط و استدلال کے مکلف تھے

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلف تھے، اس لئے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا، ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور دوسرے اولوالامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ اور یہ حکم عام ہے، جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلف تھی (احکام القرآن للجصاص)

فوائد مہمہ

○ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کے جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے، اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اختیار کرے، دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا احتمال رہتا ہے، تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔

(احکام القرآن للجصاص ملخصاً)

اجتہاد و استنباط غلبۂ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم یقینی کا نہیں

(۲) استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطاء ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے، جو عمل کے لئے کافی ہے۔ (احکام القرآن للجصاص و تفسیر کبیر)

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ

سو تو لڑ اللہ کی راہ میں تو ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کا اور تاکید کر

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ

مسلمانوں کو قریب ہے کہ اللہ بند کر دے لڑائی کافروں کی اور اللہ

اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے والا

خلاصۂ تفسیر

(جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوئی) پس آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے (اور اگر فرضاً کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے کیونکہ) آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دیدیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ ہیں، نہ تو بازپرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ مذکور ہو چکی اور نہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے جس کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے زور جنگ کو

روک دیں گے (اور ان کو مغلوب کر دیں گے) اور (گو یہ بڑے زور دار نظر آتے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ زور جنگ میں (ان سے بمراتب بے شمار) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

شانِ نزول جب غزوۂ احد شوال میں ہو چکا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدہ کے موافق بدر میں مقابلہ کے لئے جانا چاہا (جس کو مؤرخین بدر صغریٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہی خبروں کی وجہ سے جانے میں کچھ تامل کیا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کچے مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اے رسول تم تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کرو اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے، اس ہدایت کو پاتے ہی آپ ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوۂ احد کے بعد ہوا تھا، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا، اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا، اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ (قرطبی، مظہری)

قرآنی احکام کا حسن اسلوب فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ تن تنہا جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جائیے، کوئی دوسرا آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دوسرے جملہ میں یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ دوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ سے باز پرس نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ تن تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہو سکتا تھا اس کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے، اور ان کو مرعوب و مغلوب کر دے، اور آپ کو تنہا ہی کامیاب کر دے، پھر اس کے بعد اس کامیاب ہونے پر دلیل بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے جس کی قوت جنگ اور زور جنگ ان کافروں سے بدرجہا زیادہ ہے تو پھر کامیابی بھی یقیناً آپ ہی کی ہے، پھر اسی

شدتِ باس کے ساتھ اپنی سزا کی شدت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا دنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہرحال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوت وطاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ
جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے ایک حصہ اور جو کوئی
يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى
سفارش کرے بری بات میں اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر
كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ
قدرت رکھنے والا ، اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے
مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾
بہتر یا وہی کو الٹ کر بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ
اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں بیشک تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن اس میں
فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾
کچھ شبہ نہیں اور اللہ سے سچی بات کس کی بات۔

ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی جس کا طریق ومقصود دونوں مشروع ہوں) اس کو اُس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بُری سفارش کرے (یعنی جس کا طریق وغرض غیر مشروع ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں) اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ویسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر)

حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے، اور یوں اپنے فضل سے معاف کر دیں وہ اور بات ہے) اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے)۔

معارف ومسائل

سفارش کی حقیقت اور اس کے احکام اور اقسام

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً الخ اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا، اور یہ بھی بتلا دیا کہ نہ ہر سفارش بُری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور بُری سفارش کرنیوالے کو عذاب کا، آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ نَصِيْبٌ کا لفظ آیا ہے، اور بری سفارش کے ساتھ كِفْلٌ کا، اور لغت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی کسی چیز کا ایک حصہ، لیکن عرفِ عام میں لفظ نصیب اچھے حصہ کے لئے بولا جاتا ہے، اور لفظ کِفل اکثر بُرے حصہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اچھے حصہ کے لئے بھی لفظ کِفل استعمال ہوا ہے، جیسے قرآن کریم میں يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ارشاد ہے۔

شفاعت کے لفظی معنے ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ شفع عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے، اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنے طاق استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے، یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت وسفارش کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچا دیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلافِ حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعت سیئہ یعنی بُری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اسی لئے وہ بھی شفاعتِ سیئہ میں داخل ہے۔

اب خلاصۂ مضمون آیتِ مذکورہ کا یہ ہو گیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور اسی طرح جو کسی

ناجائز کام کے لئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا محروم کا کام کردے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا، اسی طرح سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش مؤثر اور کامیاب بھی ہو بلکہ اس کو بہرحال اپنا حصہ ملے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ (رواہ البزار عن ابن مسعودؓ والطبرانی عنہ وعن سہل بن سعدؓ بحوالۂ مظہری) "یعنی جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کردے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو"۔

اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ کَلِمَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ اٰیِسٌ مِّنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (مظہری)

"یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائیگا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے"

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا، لفظ "مُقِیت" کے معنی لغت کے اعتبار سے قادر و مقتدر کے بھی ہیں، اور حاضر و نگراں کے بھی، اور روزی تقسیم کرنے والے کے بھی، اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، عمل کرنے والے اور سفارش کرنیوالے کی جزاء یا سزا اس کے لئے دشوار نہیں۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں و حاضر ہے اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کر رہا ہے، محض لوجہ اللہ کسی بھائی کی امداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رشوت کے اس سے حاصل کرنا ہے۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے، جتنا کسی کے لئے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا، کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہوجائے گا، بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا، البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے، کہ وہ ایک کمزور کی اعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کَانَ اللّٰہُ فِیْ عَوْنِ عَبْدِہٖ مَا دَامَ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ

"یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے"

اسی بناء پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَیَقْضِی اللّٰہُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَا شَاءَ

"یعنی تم سفارش کیا کرو تمھیں ثواب ملے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرائیں اس پر راضی رہو"

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجب ثواب ہونا بیان فرمایا ہے وہیں یہ بھی بتلا دیا کہ سفارش کی حد یہی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک پہونچانے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو آگے وہ سفارش مانی جائے یا نہ مانی جائے، اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہئے، حدیث کے آخری جملہ میں ویقضی اللہ علی لسان نبیہ ماشاء کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کامیاب ہو، بلکہ اس ثواب و عذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے، آپ نے شفاعت حسنہ کردی تو ثواب کے مستحق ہوگئے، اور شفاعت سیئہ کردی تو عذاب کے مستوجب بن گئے، خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر بحر محیط اور بیان القرآن وغیرہ میں مَنْ یَّشْفَعْ میں لفظ مِنْہَا کو سببیہ قرار دے کر اس کی طرف اشارہ تبلایا ہے، اور تفسیر مظہری میں امام تفسیر مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ملے گا، اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو، اور یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی دوسرے انسان کے پاس جو سفارش کی جائے، اس کا بھی یہی اصول ہونا چاہئے، کہ سفارش کرکے آدمی فارغ

ہو جائے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جیسا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ اس نے جو اپنے شوہر مغیثؓ سے طلاق حاصل کر لی ہے اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کر لے؛ بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے، بریرہؓ جانتی تھیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ اصول کوئی ناگواری نہ ہوگی، اس لئے صاف عرض کر دیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی، آپؐ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعثِ اجر و ثواب تھی، آجکل لوگوں نے جو اس کا حلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی، بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو ناراض ہوتے ہیں، بلکہ دشمنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہو جائے، اکراہ و اجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے، اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کسی کے حق پر زبردستی قبضہ کر لے، وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد و خود مختار تھا، آپ نے اس کو مجبور کر کے اس کی آزادی سلب کر لی، اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کے لئے کسی دوسرے کا مال جبراً کر اس کو دیدیا جائے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہے اور حرام ہے

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس کو سخت حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشاء کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہونچانا یا مضرت اور نقصان سے بچانا ہو، اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کے لئے نہ ہو، بلکہ محض اللہ کے لئے کمزور کی رعایت مقصود ہو، اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے، اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین و مقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا بھی شفاعتِ حسنہ میں داخل ہے، اور دعاء کرنے والے کو بھی اجر

ملتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے کوئی دعاء خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے "وَلَكَ بِمِثْلٍ" یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

سلام اور اسلام

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ الخ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور اس کے جواب کے آداب بتلائے ہیں:

لفظ تحیہ کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو

تحیہ کے لفظی معنے ہیں کسی کو "حَيَّاكَ اللّٰهُ" کہنا، یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو "حیاک اللہ" یا "اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا" یا "اَنْعِمْ صَبَاحًا" وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے کا طریقہ جاری کیا جس کے معنی ہیں "تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو"

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اور "السلام علیکم" کے معنی یہ ہیں کہ "اَللّٰهُ رَقِيْبٌ عَلَيْكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے"

اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے

دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لئے کہیں، لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دعاء بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں، بلکہ حیات طیبہ کی دعاء ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہونچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے، اور اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے ضمن میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو

کا میں محافظ ہوں۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

اَتَدْرِیْ مَا السَّلَامُ؟ یَقُوْلُ اَنْتَ اٰمِنٌ مِنِّیْ	"یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے: (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہارِ تعلق و محبت بھی، (۴) اس کے لئے بہترین دعا بھی (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وارد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ (الحدیث)	"یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچے"

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کرے، بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کرے، تو شاید پوری قوم کی اصلاح کے لئے یہی کافی ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی، اور اس کو فضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائیگی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں

کو کھانا کھلا دو، اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو (صحیحین)

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتدا کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام، یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے (طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرہؓ)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا صحابۂ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا، یہ روایت مؤطا امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو اس کی تشریح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السلام علیک یا رسول اللہ" آپؐ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" پھر ایک صاحب آئے اور انھوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے: "السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ" آپ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پھر ایک صاحب آئے انھوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد فرمایا، ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی، اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ

آپ پر قربان، پہلے جو حضرات آئے آپ نے اُن کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے، اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے " وعلیک " پر اکتفاء فرمایا، آپ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے، اس لئے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفاء کر لیا، اس روایت کو ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا " السلام علیکم " تو آپ جواب دیں " وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ " اور اس نے کہا " السلام علیکم ورحمۃ اللہ " تو آپ جواب میں کہیں " وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ "۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں، اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے، اس لئے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کہنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: اِنَّ السَّلَامَ قَدِ انْتَهٰی اِلَی الْبَرَکَةِ (مظہری عن البغوی) یعنی "سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے"، اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے (ذکرہ مثلہ عن ابن کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی ادا بالمثل کے حکم میں حکم قرآنی اَوْ رُدُّوْهَا کی تعمیل کے لئے کافی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کلمہ پر اکتفاء فرمایا ہے (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہگار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے

بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ بعینہٖ انہی الفاظ سے جواب دیدیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم واجب صراحۃً بتلا دیا گیا ہے، لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے، اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے، مگر اِذَا حُيِّيْتُمْ میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کیونکہ اس لفظ کو بصیغۂ مجہول بغیر تعیین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتداء کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں، ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنت مؤکدہ سے کم نہیں تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اَلسَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَالرَّدُّ فَرِيْضَةٌ، یعنی "ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے"۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ بھی مختصر طور پر ملاحظہ کیجئے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے، اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں" کسی بڑی جماعت پر گذریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کے لئے بھی برکت ہوگی، اور اس کے گھر والوں کیلئے بھی ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے، اور جس طرح اوّل ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے، ترمذی، ابوداؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ وابوہریرہ رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں، جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسد نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے، یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے

یا انسانی ضروریات استنجاء وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

اختتام مضمون پر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا، یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں، جن میں انسان اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جواب سلام کے سب امور داخل ہیں، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لیں گے۔

پھر فرمایا اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ، یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کو معبود جانو اور جو کام کرو اس کی عبادت کی نیت سے کرو، وہ تم کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس روز سب کے بدلے عنایت فرمائیں گے، قیامت کا وعدہ اور جزاء و سزا کی خبر سب حق ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا، کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فریق ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو اُلٹ دیا بسبب

كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ

ان کے اعمال کے کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا اللہ نے اور جس کو گمراہ

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ

کرے اللہ ہرگز نہ پاوے گا تو اس کے لئے کوئی راہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ

كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ

جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ

حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ

یہاں تک کہ وطن چھوڑ آویں اللہ کی راہ میں پھر اگر اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ

اور مار ڈالو جہاں پاؤ ، اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ

دوست اور نہ مددگار مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں

وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ

اور ان میں عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ تنگ ہو گئے ہیں دل ان کے تمہاری

يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ

لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور

عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا

دے دیتا تو ضرور لڑتے تم سے سو اگر یکسو رہیں وہ تم سے پھر تم سے نہ لڑیں اور پیش کریں

اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا

اب تم دیکھو گے ایک اور قوم کو جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی

قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ

قوم سے بھی جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں پھر اگر

لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ

وہ تم سے یکسو نہ رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور اپنے ہاتھ نہ روکیں ،

فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ

تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور ان پر

ع ۱۲ / ۹ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند ۔

خلاصۂ تفسیر

تین مختلف گروہوں کا بیان اور اُن کے احکام

پہلے فرقہ کا بیان (جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم (اختلاف رائے کر کے) دو گروہ ہوگئے (کہ ایک گروہ ان کو اب بھی مسلمان

کہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) اُلٹا پھیر دیا ان کے (بد) عمل کے سبب (وہ بدعمل ارتداداً دارالاسلام کو باوجود قدرت کے چھوڑ دینا ہے، جو کہ اسوقت مثل ترکِ اقرار بالاسلام کے علامت کفر کی تھی اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہ ہوئے تھے، اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ جن کو اس ترکِ دارالاسلام کا علامتِ کفر ہونا معلوم نہیں) اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کردو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جب کہ ان لوگوں نے گمراہی اختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ عزمِ فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مؤمن گمراہ کو جو ہدایت یافتہ مؤمن کہتے ہو یہ تمہارے لئے جائز نہیں) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے (پس ان لوگوں کو مؤمن نہ کہنا چاہئے اور بھلا وہ خود کیا مؤمن ہوں گے ان کے غلو فی الکفر کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدانہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ سو (ان کی جب یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی کے جواز کے لئے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیلِ اسلام کے لئے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو اب اقرار بالشہادتین کا ہے، اور تکمیلِ اسلام کی قید اس لئے ہے کہ خالی دارالاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہلِ تجارت بھی آجاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آویں، یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ جامع اقرار و ہجرت کے ہو جاویں، اور رہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لئے ہے یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں استعانت بلکہ الگ تھلگ رہو)۔

دوسرے فرقہ کا بیان مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمہارے ساتھ مصالحت سے) رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ بواسطہ صلح ہو (یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہو جاتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے، (جیسے بنو مدلج، کہ ان سے صلح ہوئی تو ان کے ہم عہد بھی اس استثناء میں آگئے تو بنو مدلج

بدرجہ ادنیٰ مستثنیٰ ہوئے) یا (دوسرا طریق یہ ہے کہ بلا واسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ) خود تمہارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منقبض ہو (اس لئے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، پس دونوں طریقوں میں جس طریق سے کوئی مصالحت رکھے وہ حکم مذکور پکڑنے اور قتل سے مستثنیٰ ہیں) اور (تم ان لوگوں کی درخواست صلح میں اللہ تعالیٰ کا احسان مانو کہ ان کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط (اور دلیر) کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر خدا تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچا لیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے معاملہ سلامت روی کا رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کئی لفظ تاکید کے لئے فرما دیئے) تو (اس حالتِ صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اجازت نہیں دی)۔

تیسرے فرقہ کا بیان بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہوگی) کہ (براہِ دھوکہ) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (اور ساتھ ہی اس کے) جب کبھی ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے شرارت (و فساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں، اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب مثل سابق کے ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے اُن کا قتل کرنا ظاہر ہے، اور وہ حجت ان کا نقضِ عہد ہے)

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے، جن کے متعلق دو حکم مذکور ہیں، واقعات ان فرقوں کے مندرجہ روایات سے واضح ہوں گے۔

پہلی روایت: عبد بن حمیدؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے، اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے، اور

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسباب تجارت لانے کا بہانہ کر کے پھر مکہ چلے دیئے اور پھر نہ آئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے کہا یہ مؤمن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ میں بیان کر دیا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے فرمایا کہ ان کو منافق کہنا باین معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے دل سے ایمان نہ لائے تھے، اور منافقین کو قتل نہ کئے جاتے تھے لیکن جب ہی تک کہ اپنا کفر چھپاتے تھے، اور ان لوگوں کا ارتداد ظاہر ہو گیا تھا اور جنھوں نے مسلمان کہا شاید حسن ظن کی وجہ سے کہا ہو اور ان کے دلائل ارتداد میں کچھ تاویل کر لی ہوگی، اور اس تاویل کی بنیاد رائے محض ہوگی جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہوگی اس لئے معتبر نہیں رکھی گئی۔

دوسری روایت: ابن ابی شیبہؒ نے حسنؒ سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے بعد واقعہ بدر و احد کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آ کر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپؐ نے حضرت خالدؓ کو تکمیل صلح کے لئے وہاں بھیج دیا، مضمون صلح یہ تھا:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے، اور قریش مسلمان ہو جائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے، اور جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں"

اس پر یہ آیت وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ الی قولہ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ نازل ہوئی۔

تیسری روایت: حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا گیا کہ آیۃ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں جن کا ذکر ہے مراد ان سے قبیلہ اسد اور غطفان ہیں، کہ مدینہ میں آئے اور ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندر اور عقرب (بچھو) پر ایمان لائے ہیں، اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دین پر ہیں۔

اور ضحاکؒ نے ابن عباسؓ سے یہی حالت بنی عبدالدار کی نقل کی ہے، پہلی اور دوسری روایت روح المعانی اور تیسری معالم میں ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت مثل پہلی روایت والوں کے ہوئی، کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہو گیا، اسی لئے ان کا حکم مثل عام کفار کے ہے، یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے قتال نہ کیا جائے

اور مصالحت نہ ہونے کی صورت میں قتال کیا جائے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے باب میں دوسری آیت یعنی فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ میں گرفتار کرنے اور قتل کا حکم اور تیسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ میں مصالحت میں ان کا استثناء موجود ہے جن کی مصالحت کا ذکر دوسری روایت میں ہے، اور تاکید استثناء کے لئے پھر فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ کی تصریح کر دی۔

اور تیسری روایت والوں کے باب میں چوتھی آیت یعنی سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں بیان فرما دیا کہ اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ مقاتلہ کرتے ہیں تو تم ان سے جہاد کرو، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کریں تو ان سے قتال نہ کیا جائے۔

(بیان القرآن)

خلاصہ یہ کہ یہاں تین فرقوں کا ذکر فرمایا گیا:

۱۔ جو ہجرت کہ شرط اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، یا کرنے کے بعد دارالاسلام سے نکل کر دارالحرب میں چلے جائیں۔

۲۔ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کر لیں، یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کر لیں۔

۳۔ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کر لیں، اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہو جائیں، اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فریق کا حکم عام کفار کی مانند ہے، دوسرا فریق قتل اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہے، تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان آیتوں کے کل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدم صلح کے وقت قتال، اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

ہجرت کی مختلف صورتیں اور احکام

قولہ تعالیٰ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ ابتداء اسلام میں ہجرت دارالکفر سے تمام مسلمانوں پر فرض تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنے سے منع کیا ہے جو اس فرض کے تارک ہوں، پھر جب مکہ فتح ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (رواہ البخاری) "یعنی جب مکہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا تو اب وہاں سے ہجرت فرض نہ رہی" یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت شرط ایمان تھی اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود

عہ ہجرت سے متعلق بحث کے لئے تفسیر آیت نمبر ۱۰۰ سورۂ نساء دیکھئے۔

قدرت کے ہجرت نہ کرے، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔

ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ "یعنی ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے۔" (صحیح بخاری)

علامہ عینیؒ شارح بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے، اَنَّ الْمُرَادَ بِالْهِجْرَةِ الْبَاقِيَةِ هِيَ هَجْرُ السَّيِّئَاتِ "یعنی اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے" جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ "یعنی مہاجر وہ ہے جو اُن تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔" (بحوالہ مرقاۃ جلد اول)

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنیٰ پر ہوتا ہے: (۱) دین کے لئے ترکِ وطن کرنا، جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا وطن مکہ ترک کرکے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔ (۲) گناہوں کا چھوڑنا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے طلبِ نصرت حرام ہے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپ سے چاہی تو آپ نے فرمایا: اَلْخَبِيْثُ لَا حَاجَةَ لَنَا بِهِمْ "یعنی یہ خبیث قوم ہے اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں۔" (مظہری جلد ۲)

فَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرے

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

گردن ایک مسلمان کی اور خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں،

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن

مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

ایک مسلمان کی اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے،

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

تو خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ

پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو مہینے کے برابر گناہ بخشوانے کو

اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۹۲ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا

اللہ سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۝۹۲ اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝۹۳

کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب

خلاصۂ تفسیر

اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو (ابتداءً) قتل کرے لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر (شرعاً) ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا (واجب) ہے اور خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں بقدر حصص میراث) حوالہ کر دی جائے (اور جس کے کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال قائم مقام ورثہ کے ہے) مگر یہ کہ وہ لوگ (اس خوں بہا کو) معاف کر دیں (خواہ کل یا بعض اتنی ہی معاف ہو جاوے گی) اور اگر وہ (مقتول خطأً) ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں (یعنی حربی ہیں اور انہی میں کسی وجہ سے رہتا تھا) اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا، اور دیت اس لئے نہیں کہ اگر ورثہ اس مقتول کے مسلمان ہیں تب تو وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہ ہونے کے باعث مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی، اور دارالحرب سے دارالاسلام کے بیت المال میں ترکہ لایا نہیں جاتا) اور اگر وہ (مقتول خطأً) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ (صلح یا ذمہ کا) ہو (یعنی ذمی یا مصالح و مستامن ہو) تو خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کر دی جاوے، (کیونکہ کافر کا فر کا وارث ہوتا ہے) اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا)

پھر (جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنے دام ہوں کہ خرید سکے) تو (اس کے ذمہ بجائے اس کے ادا کرنے کے) متواتر (یعنی لگاتار) دو ماہ کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ مشروع ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (اپنے علم و حکمت سے مصلحت کے مناسب احکام مقرر فرماتے ہیں، گو ہر جگہ حکمت بندہ کو معلوم نہ ہو) اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہتا (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی، بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے، اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزاء دوزخ) کا سامان کریں گے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات اوپر سے قتل و قتال کا ذکر چلا آرہا ہے، اور کل صورتیں ابتداءً قتل کی آٹھ ہیں، کیونکہ مقتول چار حال سے خالی نہیں ہے، یا مؤمن ہے یا ذمی، یا مصالح و مستامن ہے یا حربی ہے، اور قتل دو طرح کا ہے یا عمداً یا خطاءً، پس اس اعتبار سے کل صورتیں قتل کی آٹھ ہوئیں، اول مومن کا قتلِ عمد، دوم مؤمن کا قتلِ خطاء، سوم ذمی کا قتلِ عمد، چہارم ذمی کا قتلِ خطاء، پنجم مصالح کا قتل عمد، ششم مصالح کا قتلِ خطاء، ہفتم حربی کا قتلِ عمد، ہشتم حربی کا قتلِ خطاء۔

ان صورتوں میں بعض کا حکم تو اوپر معلوم ہو چکا، بعض کا آگے مذکور ہے، اور بعض کا حدیث میں موجود ہے، چنانچہ صورتِ اولیٰ کا حکم دنیوی یعنی وجوبِ قصاص سورۂ بقرہ میں مذکور ہے اور حکم اخروی آگے آیت وَمَنْ يَّقْتُلْ میں آتا ہے، اور صورتِ دوم کا بیان قول اللہ تعالیٰ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ (الی قولہ) وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ میں آتا ہے، اور صورتِ سوم کا حکم حدیث دار قطنی میں ہے کہ ذمی کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے قصاص لیا (اخرجہ الزیلعی فی تخریج الہدایہ) صورتِ چہارم کا ذکر قول اللہ تعالیٰ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ میں آتا ہے، صورتِ پنجم کا ذکر اوپر کے رکوع قول اللہ تعالیٰ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا میں آچکا ہے،

صورتِ ششم کا حکم صورتِ چہارم کے ساتھ ہی مذکور ہے، کیونکہ میثاق عام ہے جو ذمی اور دائمی دونوں کو شامل ہے، پس ذمی و مستامن دونوں آگئے، درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں مستامن کی دیت کے وجوب کی تصحیح کی ہے، صورتِ ہفتم و ہشتم کا حکم خود جہاد کی مشروعیت سے اوپر معلوم ہو چکا، کیونکہ جہاد میں اہلِ حرب قصداً مقتول ہوتے ہیں، اور خطاء کا جواز بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا۔ (بیان القرآن)

قتل کی تین قسمیں اور ان کا شرعی حکم

پہلی قسم: عمد:۔ جو ظاہراً قصد سے ایسے آلہ کے ذریعہ سے واقع ہو جو آہنی یا تفریقِ اجزاء میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا بانس یا دھار والا پتھر وغیرہ۔

دوسری قسم: شبہ عمد:۔ جو قصداً تو ہو مگر ایسے آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاء میں تفریق ہو سکتی ہو۔

تیسری قسم: خطاء:۔ یا تو قصد و ظن میں کہ درخت سے آدمی کو شکاری جانور یا کافر حربی سمجھ کر نشانہ لگا دیا یا فعل میں کہ نشانہ تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جا لگا، اس میں خطاء سے مراد غیر عمد ہے، پس دوسری، تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں، دونوں میں دیت بھی ہے، اور گناہ بھی ہے، مگر ان دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔ دیت دوسری قسم کی سو اونٹ ہیں، چار قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے پچیس پچیس، اور دیت تیسری قسم کی سو اونٹ ہیں، پانچ قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے بیس بیس، البتہ اگر دیت میں نقد دیا جائے تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی یا ایک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ دوسری قسم میں زیادہ ہے بوجہ قصد کے، اور تیسری قسم میں کم صرف بے احتیاطی کا (کذا فی الہدایۃ) چنانچہ تحریرِ رقبہ کا وجوب و نیز لفظ توبہ بھی اس پر دال ہے، اور یہ حقیقت ان تینوں کی دنیا میں جاری ہونے والے احکامِ شرعیہ کے اعتبار سے ہے، اور گناہ کے اعتبار سے عمد و غیر عمد ہونا، اس کا مدار قلبی قصد و ارادہ پر ہے، جس پر وعید آئندہ کا مدار ہے، وہ خدا کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ اس اعتبار سے قسم اول غیر عمد ہو جاوے اور قسم ثانی عمد ہو جاوے۔

مسئلہ: یہ مقدار مذکور دیت کی جب ہے کہ مقتول مرد ہو اور اگر عورت ہو تو اس کی نصف ہے (کذا فی الہدایۃ)

مسئلہ: دیت مسلم اور ذمی کی برابر ہے، قول رسول علیہ السلام دِيَةُ كُلِّ ذِيْ عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ اَلْفُ دِيْنَارٍ (کذا فی الہدایۃ اخرجہ ابوداؤد فی مراسیلہ)۔

مسئلہ: کفارہ یعنی تحریر رقبہ یا روزے رکھنا خود قاتل کو ادا کرنا پڑتا ہے، اور دیت قاتل کے اہل نصرت پر ہے جن کو شرع کی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں (بیان القرآن)

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور انصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں! وجہ دراصل یہ ہے کہ اس میں قاتل کے اولیاء بھی قصور وار ہوتے ہیں، کہ انھوں نے اس کو اس قسم کی بے احتیاطی کرنے سے روکا نہیں، اور دیت کے خوف سے آئندہ وہ لوگ اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے۔

مسئلہ: کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہیں، لفظ رقبۃ عام ہے، البتہ ان کے اعضاء سالم ہونے چاہئیں۔

مسئلہ: دیت مقتول کی شرعی ورثہ میں تقسیم ہوگی، اور جو اپنا حصہ معاف کردے گا اس قدر معاف ہوجائے گی، اور اگر سب نے معاف کردیا سب معاف ہوجائے گی۔

مسئلہ: جس مقتول کا کوئی وارث شرعی نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دیت ترکہ ہے اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔ (بیان القرآن)

مسئلہ: اہل میثاق (ذمی یا مستامن) کے باب میں جو دیت واجب ہے ظاہر یہ ہے کہ اس وقت ہے جب اس ذمی یا مستامن کے اہل موجود ہوں، اور اگر اس کے اہل نہ ہوں، یا وہ اہل مسلمان ہوں اور مسلمان کافر کا وارث ہو نہیں سکتا، اس لئے وہ بجائے نہ ہونے کے ہے، تو اگر وہ ذمی ہے تو اس کی دیت بیت المال میں داخل کی جائیگی، کیونکہ ذمی لاوارث کا ترکہ جس میں دیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے، (کما فی الدر المختار) ورنہ واجب نہ ہوگی (بیان القرآن)

مسئلہ: روزے میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہا ہو تو از سر نو رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض کی وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی عذر سے روزہ پر قدرت نہ ہو تو قدرت تک توبہ کیا کرے۔

مسئلہ: قتل عمد میں یہ کفارہ نہیں توبہ کرنا چاہئے۔

(بیان القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

اور مت کہو اس شخص کو کہ جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ

تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں

كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

ہیں تم بھی تو ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا

فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾ لَا

سو اب تحقیق کرو بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے برابر

يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ

نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں،

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ

اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے،

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے

عَلَي الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰي ۭ وَفَضَّلَ

بیٹھ رہنے والوں پر درجہ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا اور زیادہ کیا

اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ

اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں جو کہ درجے ہیں

ع ۱۳ ۵ ۱۰ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے اور مہربانی ہے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان